''سیّدی وَ اَبی''......ایک تأثر

محمد الیاس میراں پوری

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی شخصیت میں کچھ ایسا سحر، کچھ ایسی کشش تھی کہ انھیں عالمِ فنا سے عالمِ بقا کی جانب سفر کیے نصف صدی سے زائد عرصہ بیت چکا، زمانے نے کئی کروٹیں بدلیں، کئی اقدار، کئی روایات ختم ہوئیں اور گردشِ ایام کے بہت سے نئے رنگ نمایاں ہوئے، لیکن شاہ جی کا نام آج بھی محترم ہے۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن۔ تاریخ کے اوراق پر روشن تر۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

خدا نے وہ سانچہ ہی توڑ دیا ہے جس میں اس قسم کے لوگ ڈھلا کرتے تھے۔ ایک مردِ حُر کہ جس نے فرنگی سامراج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی جرأت، غلام ہندوستان کے ہر کوچہ و بازار میں عام کی۔ سامراج کے انخلاء کے لیے اپنی پوری زندگی جیل اور ریل کی نذر کر دی۔ کبھی مصلحت کا شکار نہ ہوئے۔ وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ایک عہد، ایک روایت بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ پٹنہ میں بچپن، امرتسر میں جوانی اور ملتان میں بڑھاپا گزار کر جب شاہ جی نے اس دنیا سے رختِ سفر باندھا تو پاکستان اور ہندوستان کے ہر گوشے ہر کونے میں، کروڑوں ساعتوں میں ان کی شعلہ بیانی اور خوش الحانی کی گونج لرزاں تھی اور اتنی ہی آنکھوں میں آنسو۔ ان آنسوؤں کا ساحل ملتان تھا۔ امیر خسرو نے غیاث الدین بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا تھا۔ مرثیے کے اس شعر کا انطباق شاہ جی پر بھی ہوتا ہے:

بسکہ آبِ چشم خلقی شد رواں در چار سو
پنج آب دیگر اندر مولتاں آمد پدید

''لوگوں کی آنکھوں کا پانی (آنسو) اتنی روانی سے بہہ رہا ہے جیسے ملتان میں پانچ دریاؤں کا پانی آ گیا ہو۔''

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے فن اور شخصیت پر متعدد مصنفین نے طبع آزمائی کی۔ جن میں شورش کاشمیری (سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ سوانح و افکار)، جانباز مرزا (حیاتِ امیر شریعت)، خان غازی کابلی (حیاتِ بخاری) قابل ذکر ہیں۔ یہ کتب اپنے مواد، اسلوب اور اندازِ بیان کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ چھوٹی بڑی بیسیوں کتب اور بھی ہیں۔ اس کے علاوہ شاہ جی پر مختلف رسائل و جرائد نے خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا۔ قومی اخبارات میں شاہ جی کی یاد میں مضامین چھپتے رہے۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے ''اردو ادب و خطابت کی روایت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمات'' کے عنوان سے استادِ محترم پروفیسر محمود الحسن قریشی مرحوم (م: ۲۴ر جنوری ۲۰۰۶ء) پی ایچ ڈی کر رہے تھے لیکن موت نے انھیں مہلت نہ دی۔ شاہ جی جیسی عظیم شخصیت پر اب تک ویسا وسیع کام بہر حال نہیں ہو سکا جس کی ضرورت تھی۔

''سیدی وَ اَبی'' شاہ جی کی صاحبزادی سیدہ ام کفیل بخاری کی تالیف ہے۔ بنتِ امیر شریعت نے اپنے عظیم والد کی یادوں کی مالا بنائی ہے۔ عقیدت و محبت کے موتیوں کی یہ مالا حسن و خوبی اور خوش سلیقگی کی بہترین مثال ہے۔ اسلوب میں سلاست اور روانی ایسی ہے کہ قاری کو تکان یا بیزاری کا احساس نہیں ہوتا۔ علمی رعب اور لغت کے بھاری الفاظ کے بوجھ سے قاری کو الجھایا نہیں گیا۔ ایک سادگی ہے جو قاری کو فوری طور پر متاثر کرتی ہے اور اسے کتاب خوانی پر راغب کرتی ہے۔ پُر تکلف نثر پر سادہ بیانی ہمیشہ سبقت لے جاتی ہے۔ یہی خوبی اس کتاب کو اعلیٰ نثری ادب میں شامل کرتی ہے۔

''سیّدی وَ اَبی'' اس لحاظ سے اہم ہے کہ شاہ جی پر ان کے کسی فردِ خانہ کی طرف سے لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے اور دوسری سوانحی کتب سے بالکل مختلف، منفرد اور الگ تھلگ۔ اس میں عہدِ ماضی کے کئی مخفی گوشوں کی نقاب کشائی بھی کی گئی ہے۔ اس میں شاہ جی کے خاندانی حالات کا تذکرہ بھی ہے اور شجرہ نسب کی تفصیل بھی۔ جو پڑھنے والے کی علمی تشنگی کو کم کرتی ہے۔ اس میں نصیحت کا انداز بھی ہے اور صبر، قناعت، استقامت، بہادری، شجاعت، اولاد کی دینی تربیت جیسی ایمانی کیفیات کا اظہار بھی۔

ہر والد کو اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے لیکن بیٹی کے ساتھ بیٹوں کی نسبت کہیں زیادہ۔ شاہ جی کو بھی بیٹی سے بہت محبت تھی:

''میری بیٹی...... میرے ظاہری اسباب میں سے، میری حیات کا باعث ہے۔ اللہ بیٹوں کو بھی سلامت رکھے، مگر بیٹی سے مجھے محبت بہت ہے۔''

''سیّدی وَ اَبی'' ادبیت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یعنی وہ نثری خوبیاں جنھیں ہم کلاسیکی نثر میں تلاشتے ہیں، اور جو وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدے کی دین ہوتی ہیں۔ عظیم بیٹی کو الفاظ کے لیے مطلقاً کاوش نہیں کرنا پڑی بلکہ حروف خود بخود الفاظ کے سانچے میں ڈھلتے چلے گئے۔ انھوں نے شاہ جی کے فکر و فن کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ گویا وجہی کے الفاظ میں ''دودھ میں آب لوچ گھول لیا ہے۔'' ملاحظہ کریں:

''اگر مہرِ نیم روز کے سامنے مٹی کا دیا جلا کر سورج کی روشنی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یا شب ماہتاب میں شمع جلا کر رات کی تاریکی کم کی جا سکتی ہے یا نسیم سحر کے روح پرور

اور جاں فزا جھونکوں کے روبرو دستی پنکھے ہواؤں کو روح میں اتار سکتے ہیں تو پھر میرے ابا جی کی شخصیت کا حسن و وقار الفاظ سے اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ اولاد ہونے کے ناتے ابا جی ہمارے لیے تو دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت تھے...... ع

پھر ان کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

ہمارے لیے تو ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز ہی اصول زیست تھے اور ہیں۔ کبھی ان کی قدر و منزلت ان کو بصر اپنوں، بیگانوں سے بھی پوچھی جائے کہ جنھوں نے ان سے نہ صرف یہ کہ اختلاف کیا بلکہ مخالفت کی پستیوں میں اترتے چلے گئے۔ الزام و دشنام کے ہر ہر گوشے کو، اِن ''مسلمان'' کہلانے والوں نے یوں گرمایا کہ ہر سو شرافت دم توڑ گئی اور حیا سرنگوں ہو گئی۔''

''سیدی وَ اَبی'' کا مقدمہ شاہ جی کے نواسے محترم کفیل بخاری نے لکھا ہے۔ الفاظ کا شکوہ، اسلوب کی لطافت و روانی...... بقول شخصے اردو شاہ جی کے گھر کی لونڈی ہے۔ اور خطابت تو ویسے ہی ان کا موروثی ملکہ ہے۔

''سیدی وَ اَبی'' دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں سوانحی حالات ہیں جبکہ دوسرے باب میں شاہ جی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے اپنی بیٹی کے نام جیل سے لکھے ہیں۔ یہ ۲۳ خطوط ہیں۔ ان خطوط کی اہمیت اس لحاظ سے بھی مسلمہ ہے کہ یہ ملک کے آزاد ہونے کے صرف پانچ سال بعد، اس کی نظریاتی شناخت کے تحفظ کے لیے چلائی گئی ایک عظیم الشان عوامی تحریک (ایجی ٹیشن) کے قائد کے خطوط ہیں۔ ان خطوط میں پُر تکلف انداز کی بجائے روزمرہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ شاہ جی کے کتنے ہی ذاتی احوال و آثار ان خطوں کے ذریعے سے پہلی بار منظر عام پر آئے ہیں۔ ان خطوں میں جیل کی جان لیوا صعوبتوں کا ذکر تک نہیں ورنہ جیل میں پہنچ کر تو بڑے بڑوں کی قبائیں ڈھیلی اور عزائم یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن شاہ جی کی کوہ ہمالیہ جیسی استقامت میں لغزش تک نہیں آئی۔ انھوں نے قیدِ قفس کو منتقلیٔ مکان کا نام دیا ہے۔ شاہ جی نے خود جیل میں رہ کر، جیل سے باہر کے لوگوں کو صبر، قناعت، ہمت اور استقامت کا درس دیا۔ اپنے نام ور اور نابغہ معاصرین سے شاہ جی کے بے تکلفانہ مراسم کی بعض جھلکیاں بھی اس کتاب کے ذریعے سے سامنے آتی ہیں۔ شاہ جی کے یہ خطوط معروضی اعتبار سے ان کے شخصی اور سوانحی مطالعے کے لیے ایک کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔

کتاب میں کئی واقعات ہیں کہ جو پڑھنے والے کی آنکھوں کو نم کر دیتے ہیں۔ یہ شاہ جی کی ذاتی زندگی کی جھلکیاں ہیں۔ ان واقعات و حوادث کو ایک بیٹی نے من و عن بیان کر دیا۔ ایک ایسی دستاویز جس میں شاہ جی کی قومی جدوجہد کا تذکرہ تاریخی حقائق کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ تقسیم سے قبل متحدہ ہندوستان میں تقسیم کے بعد پاکستان میں سچائی کی خاطر لڑنے والوں پر کیا گزری۔ یہ اُس زمانے کی سیاسی تاریخ بھی ہے اور مختلف شخصیات کا تذکرہ بھی۔ یہ شخصیات مذہبی بھی تھیں اور ادبی و سیاسی بھی۔ ابوالکلام آزاد اور محمد علی جوہر سے لے کر اقبال اور ظفر علی خاں تک، مفتی کفایت اللہ اور مولانا شبیر احمد عثمانی سے لے کر مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد علی لاہوری تک، جگر مراد آبادی اور حفیظ جالندھری سے لے کر ڈاکٹر تاثیر، فیض احمد فیض اور عبدالحمید عدم تک۔ برصغیر پاک و ہند کے بڑے بڑے شاعر، رند بھی اور زاہد بھی، شاہ جی سے محبت اور دوستی کا دم بھرتے تھے۔ اُن کی شخصیت مسلک و مشرب کے دائروں سے ارفع و اعلیٰ تھی۔

اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ خطابت جو یونانی ادب کا اہم جز تھی، اس نے اردو میں بھی ایک ایسے نابغہ سے روشناس کروایا جسے عالمی ادب میں فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔

موضوعِ کتاب اور مؤلفۂ کتاب دونوں کا مقام اتنا بلند ہے کہ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا کہ ان کے بارے میں اظہارِ خیال کر سکوں لیکن محبت اور عقیدت نے یہ چند الفاظ مجھ سے از خود لکھوا لیے ہیں یعنی......

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست